مترجمہ خواجہ بدر

اسپینوزا کا فلسفۂ مذہب

اسپینوزا کے مذہبی خیالات کا مطالعہ ان تاریخی حالات کی روشنی میں کرنا چاہیئے جو اس زمانے میں کارفرما تھے۔ اور اس کے تصورات کو ان اصطلاحات میں بیان کیا جانا ضروری ہے جو موجودہ دور میں اس کے نظریات کے حامیوں کے نزدیک صحیح اور قابل فہم ہیں۔ انسانی زندگی کا اہم مسئلہ (جسے ہم حصول نجات کہہ سکتے ہیں) اسپینوزا کے نزدیک ناکام خواہشات کے باعث پیدا ہوتا ہے[۱]۔ جب ہم اپنی قسمت اور اپنی حالت پر غور کرنا شروع کرتے ہیں اور اس کی بہتری کے متعلق سوچتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دل میں چند اشیاء یا چند مقاصد کی تڑپ موجود ہے چونکہ ہمیں ان اشیاء کے حصول کی لگن ہوتی ہے اس لئے ہمیں یہ اشیاء اچھی یا بھلی معلوم ہوتی ہیں اور ہمارے اندر محبت، امید، ڈر اور پریشانی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ عام طور پر یہ تمام اشیاء تین حصوں میں منقسم کی جا سکتی ہیں: دولت، شہرت اور شہوانی لذت۔ لیکن ان خواہشات کے حصول میں ہمیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض حالات میں مطلوبہ شے یا مقصد ہماری دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ اس کی خواہش ہمارے دل سے کبھی محو نہیں ہوتی، اگرچہ ہمیں وہ کبھی حاصل نہ ہو سکے۔ ناکامی کی یہ ایک عام قسم ہے۔ بعض حالات میں ہم اپنا مطلوبہ مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن بہت جلد اس کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ متوقع خوشی حاصل ہونا تو کجا بعض دفعہ وہ کئی قسم کی تکالیف و پریشانیوں کا موجب بن جاتا ہے۔ یہ بھی ناکامی کی ایک مختلف مگر کثیر الوقوع قسم ہے۔ یہی وہ حالات ہیں جن سے انسان نجات کا خواہاں ہوتا ہے۔

اسپینوزا کے نقطۂ نگاہ سے یہ واقعات اور حالات اس غایتی یا مقصدی دینیاتی فکر کی تردید

۱۔ "فہم کی اصلاح" صفحہ ۳۰۱، اسپینوزا کی مکمل تصنیفات، ایلویس (ایڈیشن، جلد اول)

کرتے ہیں جو کچھ الک مفکرین اور ساسیین نے پیش کیا تھا۔ یہ کائنات انسانی خواہشات کی تسکین یا انسان کے فوائد کی خاطر تخلیق نہیں کی گئی اگر ایسا ہوتا تو ناکامی کبھی پیش نہ آتی اور اگر کبھی ایسی حالت شاذ و نادر پیدا ہوتی تو وہ قابل تشریح ہوسکتی۔ اس وقت وہ استثنائی حالت نہیں بلکہ ایک عمومی حقیقت ہے[1]۔ یہ صحیح ہے کہ اگر یہی خارجی شہادت کی بنا پر معلوم ہو کہ ان تمام ناکامیوں کے ہوتے ہوئے ایک ذاتِ باری موجود ہے جو انسانوں کی بھلائی کے لئے کارفرما ہے تو ان تلخ تجربات کے باوجود ہمارا عقیدہ متزلزل نہیں ہوتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بھلائی کا اپنا تصور ناقص ہے اور اس کائنات کا سارا عمل مجموعی طور پر ہماری ہی بھلائی کے لئے ہے جس کو ہم اپنی ناقص عقل سے نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن یہ انسانی تجربہ ہی ہے جس کو ہم ایک ریاضیاتی نظام کی روشنی میں دیکھیں جو ہمیں اس کائنات کی صحیح ماہیت کے متعلق تمام شہادت مہیا کرتا ہے۔ اس لئے ان بے شمار ناکامیوں کو ہم کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کرسکتے اور انہی کی بنا پر اس کائنات کے متعلق نظریہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہ نظریہ بالکل سادہ ہے اس کو ہم یوں بیان کرسکتے ہیں: اس کائنات کے واقعات ہماری بھلائی کی خاطر عالم وجود میں نہیں آتے بلکہ اس لئے پیش آتے ہیں کہ ان کا واقع ہونا ان کی فطرت کا لزوم ہے۔ ان کا وقوع انسانی خواہشات و تمناؤں کا تابع نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی فطرت کے اقتضاء کے باعث عالم وجود میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہماری ناکامیوں اور ان سے پیدا ہونے والی تلخیوں کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے اپنی خواہشات، جذبات اور اعمال کو خارجی حالات کے مطابق نہیں کیا۔ اگر ہمیں کسی قابل اعتماد خوشی کا باعث حاصل ہوجاتا ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم نے دانائی سے یا اتفاقی طور پر اس لزومی نظام سے مطابقت پیدا کرلی ہے۔

اسپینوزا کے ہاں کائنات کے ایک خارجی اور لزومی ڈھانچے کا تصور ریاضیاتی تصورات کا

۱۔ ڈبلیو لپ مین (W. LIPPMAN) "اخلاقیات کا ابتدائیہ" صفحہ ۱۷۵ و مابعد

مرہونِ منت تھا۔ اسپینوزا ایک جدید سائنس داں نہ تھا اور نہ اس کے سامنے وہ فوائد تھے جو مقداری کلیات کی تشکیل سے طبعیات کو حاصل ہو سکتے تھے۔ اس کے سامنے ریاضیات کی اہمیت صرف اس قدر تھی کہ اس سے کائنات کی ایسی تعبیر حاصل ہوتی جس میں یہ معروض، ناگزیر اور غیر جانب دار لزومیت کارفرما تھی۔ جب ہم یہ سمجھ لیں کہ اس دنیا کے مختلف واقعات حقیقتِ مطلقہ سے اسی طرح صادر ہوتے ہیں جس طرح کہ تکون کے متعلق مختلف مسائل (مثلاً یہ کہ اس کے تین زاویوں کا مجموعہ دو قائموں کے برابر ہے) تکون کی تعریف اور اس کی ماہیت سے حاصل ہوتے ہیں تو ہم نے اس دنیا کے متعلق وہ تصور قائم کیا جو ہمارے تجربے کی رو سے بالکل صحیح اور درست ہے۔ اگر ہم اپنے تجربے کی اس راہنمائی میں اس نتیجہ کو ایک عمومی اور کلی شکل میں پیش کریں اور دنیا کی ہر شے اور ہر واقعہ کو اسی طرح سمجھیں (جس طرح طامس نے اپنے تمائی نظریے کے ماتحت کیا)، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ انسان کے وہ اعمال بھی جو مقصدی نوعیت رکھتے ہیں۔ اس عنوان کے تحت لا کر سمجھے جا سکتے ہیں۔ اپنی خواہشات اور جذبات کے متعلق بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس لئے ظاہر نہیں ہوتے کہ یہ ہماری بھلائی کے لئے ہیں۔ یقیناً ہم بہت جلد ہی یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ان میں سے اکثر ہمارے لئے صحیح معنوں میں فائدہ مند نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ان کا ظاہر ہونا چند مقررہ علتوں کا نتیجہ ہے اور جن کا نہ ہونا ان علتوں کی موجودگی میں ناممکن ہے۔ اس حقیقت سے ہماری بے خبری اور ناواقفیت کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی محبت اور اپنی تمناؤں اور خواہشات کا شعور تو ہوتا ہے لیکن ان کے وجوہات سے کلی طور پر بے خبر ہوتے ہیں۔[۱]

اب جب ہم اپنی ناکامیوں پر غور کرتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ دنیا ہمارے لئے نہیں بنائی گئی بلکہ مقررہ قوانین کے مطابق چل رہی ہے تو زندگی کا مسئلہ کیا صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کی عمومی صورت یہ ہے کہ کیا کوئی ایسی اچھی اور بھلی شے بھی ہے جس کی خواہش اور تمنائیں

۱۔ اسپینوزا۔ اخلاقیات۔ حصہ اول کا ضمیمہ۔ ایلوس ایڈیشن جلد اول۔

ہمیں کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ان بے کار، عارضی اور ہر دم متغیر مقاصد کی جگہ جو ہمیں آسانی سے اپنی طرف متوجہ کر لیتے اور جذبات کو ابھارتے ہیں کسی ایسے مقصد کے حصول میں منہمک ہوں جو ابدی طور پر مطلق خیر ہو اور جس سے وصال پانے پر ہم "مسلسل، بلند ترین اور نہ ختم ہونے والی خوشی اور سعادت" حاصل کر سکیں[1]؟ اگر یہ ممکن ہے تو ایسا عظیم الشان خیر کہاں پایا جا سکتا ہے اور اس سے کیسے محبت کی جا سکتی ہے؟ ان سوالوں کے جواب سے نجات کے مذہبی تصور کا مفہوم متعین ہوگا اور اسی سے ہمیں معلوم ہوگا کہ کس طرح اس نجات کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس سوال کے تسلی بخش جواب کے لئے ہمیں ناکامیوں کے تجربے کا مطالعہ پھر سے کرنا ہوگا۔ یعنی اس کی وجہ کیا ہے اور کس طرح ہم اس سے بعض دفعہ بچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ ہماری جہالت اور ناواقفیت ہے۔ جب ہم کسی ایسی شے کی تمنا کرتے اور اس کو حاصل کرنے کی خواہش کرتے ہیں جو ہماری دسترس سے باہر ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان اشیاء کو اپنی قوتوں کی وسعت کے لحاظ سے نہیں جانچا پرکھا۔ اگر ہمیں ان کے ناقابل حصول ہونے اور ان کے ساتھ ہمارے جذباتی انس و کشش کے بے کار ہونے کا احساس ہوتا تو ہم ان کی خواہش ہی نہ کرتے اور ان کی بجائے ہماری توجہ ایسے مقاصد پر مبذول ہوتی جو ہمارے قبضۂ اختیار یا قدرت میں ہوں جب ہم ایسے مقاصد کے متلاشی ہوں کہ اگر ہم انہیں حاصل کر لیں تو ان سے متوقع خوشی یا اطمینان حاصل نہ ہو تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ ہم نے انہیں اور اپنے ان جذبات کو نہیں سمجھا جو ان کے لئے سرگرداں ہیں۔ اگر ہم سمجھ لیتے تو ہم اتنے مایوس نہ ہوتے اور ان کی جگہ دوسرے مقاصد کے حصول کی سعی کرتے[2]۔

---

[1] "اصلاح فہم" صفحہ۔

[2] اخلاقیات حصہ پنجم۔ مسائل ۱-۶۔

اس سے معلوم ہوا کہ نجات کا دار و مدار علم پر اور خاص کر اشیاء سے متعلق ہماری خواہشات اور ہمارے جذبات کے علم پر منحصر ہے۔

آگے جانے سے پیشتر اس استدلال کی صحیح اہمیت محسوس کرنے کے لئے بہتر ہے کہ ہم اس کا جو جواب کچھ لوگ اور اسپینوزا نے دیا ہے اس سے موازنہ کر لیں۔ کیا انسانی عقل اس چیز کی اہل ہے کہ انسان اور اس کی دنیا کو سمجھ سکے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کائنات ایک مقصد کے ماتحت چل رہی ہے اور اس میں انسان کی حیثیت اگر بلند ترین نہیں تو بلند ضرور ہے اور اس کو اس زندگی کو کامیابی سے گذارنے کے لئے عقل کے ساتھ وحیِ آسمانی کی ہدایت بھی میسّر ہے۔ اس نظریے کی روشنی میں ان کا جواب یکساں نہ تھا۔ انسانی عقل ایک حد تک تو اہل ہے اور اس حد بندی کا کام بھی وہ کر سکتی ہے۔ اس حد سے پرے وہ مجبور ہے۔ پروٹسٹنٹ راسخ العقیدہ لوگ تو عقل کی اہلیت کے بہت کم قائل تھے ان کا خیال تھا کہ تائیدِ ایزدی کے بغیر انسان کی عقل بے کار محض ہے اور غلطی کی طرف مائل ہونے کا رجحان رکھتی ہے اس لئے شروع ہی سے وحی کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنا بہتر ہے۔ ان کے برعکس اسپینوزا ایک جرأت مندانہ عقلیت پسندی کا علمبردار ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس طرح عقل کی کم مائیگی کا اقرار اور وحی کی ضرورت پر اصرار ایک عظیم غلطی اور نادانی کا غمّاز ہے[1]۔ اس عقلیت پسندی کے نزدیک مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اگر حقائق کی دریافت میں انسان کی عقل قابل اعتماد ہے تو اس کی اہلیت خدائی علم کے مماثل ہے۔ اگر وہ قابل اعتماد نہیں تو پھر جب اس عقل کی بنا پر وحیِ خداوندی کی ضرورت کا اثبات کیا جاتا ہے تو پھر یہ احساس بھی غلط متصور ہونا چاہیئے۔ پہلی حالت میں اس کو کسی مدد یا اصلاح کی ضرورت نہیں۔ دوسری حالت میں وہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی۔ خود وحی کے متعلق اثبات بھی غیر یقینی ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ انسانی عقل قابل اعتماد ہے یا نہیں؟

۱۔ اس سلسلہ میں دیکھئے اسپینوزا کی کتاب: "دینیاتی اور سیاسی مقالہ" باب ۱۵/۲۲-۶۔ اس کے خطوط بھی دیکھئے خاص کر وہ خط جو اس نے بلائن برگ (۱۶۶۵) کو لکھا۔

ریاضیات سے وابستہ توقعات کو دیکھتے ہوئے اسپینوزا کو اعتماد تھا کہ اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔ اور اس کا فلسفہ اسی مثبت جواب پر مبنی ہے۔ انسانی فکر کی صداقت کا آخری معیار وحی خداوندی نہیں بلکہ وہ معیار ہے جس کو ہم کامیابی سے ریاضیاتی استدلال میں استعمال کرتے ہیں — انسان کے تفہیمی شعور کی وہ واضح حالت جب وہ اشیاء کی ماہیت کا صحیح تعقل کرتا ہے۔[1]

چنانچہ اسپینوزا کے فلسفۂ مذہب میں فوق الفطرۃ وحی کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا اور اس لئے عقل کو کسی ماورائے فطرۃ منبع علم سے مدد حاصل کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی عقل عالم کل ہے۔ ان کے نزدیک عقل کی حدود ہیں جن کو محسوس کرتی اور متعین کرتی ہے۔ لیکن ان حدود کو وحی خداوندی کے ذریعے عبور کرنے کا تصور ترک کر دیا گیا۔ یہ حدود قطعی طور پر ناقابل عبور ہیں اور جب کبھی وہ پیش آئیں تو ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ انسان اپنی ذات میں لامحدود نہیں۔ اسپینوزا کا خیال ہے کہ ہم جب اشیاء کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم ان کو دو حالتوں میں پاتے ہیں: یا تو وہ تفکر کی صورتیں ہیں یا پھیلاؤ اور حرکت کی صورتیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ فطرت وجود کے ان دو ابعاد ہی تک محدود ہے۔ بعض حدود جو ہمیں اس وقت ناقابل عبور نظر آتی ہیں وہ درحقیقت ہماری علمی دسترس کے باعث ہیں۔ جب ہم ان سے دوچار ہوں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم کوئی ایسا طریقہ دریافت کریں جن سے ہم اشیاء کی ماہیت کے نئے پہلو دریافت کر کے اپنے موجودہ علم میں اضافہ کرتے رہیں اس فلسفۂ مذہب کے مطابق (کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نقطۂ نگاہ کے خلاف) انسانی عقل کی پہنچ کافی دور تک ہے جس کے باعث ہم نجات کے راستہ پر گامزن ہو سکتے ہیں چنانچہ اگر ہم وحی کی مدد کو ترک کر دیں تو نتیجہ خطرناک نہیں ہوگا۔ وہ علم جو انسان کی دسترس کے اندر ہے ابدی اور مطلق خیر کے انکشاف کی کلید مہیا کر سکتا ہے۔ لیکن وہ علم کو طرح

---

[1] "اصلاح فہم" صفحہ ۱۲۷

کا ہونا چاہیئے؟

اس کے لئے دو قسم کے علم کی ضرورت ہے۔ ہم اپنے ماحول سے وابستہ ہیں اور اس ماحول کی مختلف اشیاء ہمارے جذبات کو برانگیختہ کرتی اور خواہشات پیدا کرتی ہیں۔ اس حیثیت میں ہمیں اپنی ذات کے علم کی ضرورت ہے دوسری طرف ہمیں اس کائنات کے متعلق علم کی ضرورت ہے۔ ان دونوں حالتوں میں علمیت کا قانون ہمارا رہنما ہونا چاہیئے، نظری اور عملی دونوں حیثیتوں میں۔ ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ کسی شئے کا صحیح علم ـــ ایسا علم جس کے باعث ہم اپنے آپ کو اس کے وجود کے مطابق کر سکیں ـــ وہ علم ہے جس میں اس کی نزدیکی علتوں کا بھی علم شامل ہو۔ فرض کیجئے کہ ہم کسی علت کو کارفرما دیکھتے ہیں جس کا ہمیں علم ہو کہ ایک خاص معلول پیدا ہوگا۔ اگر ہم کسی ایسے مقصد کی تلاش میں منہمک ہیں جس کے حصول کا انحصار اس معلول کے نہ ظاہر ہونے پر ہو تو ہم اس علم کی روشنی میں اپنی کوشش اور اپنے مقصد کو بدل سکتے ہیں اور اس کی بجائے ایسے مقاصد کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جن کا حصول سلسلۂ علت و معلول کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسا علم خود ایک مؤثر علت ہے ـــ کسی خارجی واقعہ کی علت نہیں بلکہ داخلی پسند و ناپسند کے فیصلے کی علت۔ جب ہم اشیاء کو اپنے جذبات سے تعلق کی حیثیت میں سمجھ لیں تو اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے جذبات میں ایک تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جذبات جو ان سے ناموافق ہوں ختم ہو جاتے ہیں یا کم از کم کمزور ہو جاتے ہیں اور جو باقی رہ جاتے ہیں وہ عقل کی ہدایت کے تابع ہو کر چلتے ہیں[1]۔

علم و تفہیم کے یہی دو پہلو ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہے۔ علتی علم حاصل کرنے اور اس کی مدد سے اپنے آپ کو کائنات سے مطابق کرنے کے لئے ہمیں ایک طرف اس کائنات (بحیثیت مجموعی) کی ماہیت کا ایک واضح علم کی ضرورت ہے۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ

۱۔ اخلاقیات حصہ چہارم قضیات ۷۔ ۱۴؛ حصہ پنجم قضیات ۷۔ ۱۰۔

یہ مقصدی یا غائی نہیں جو ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ یہ ایک ریاضیاتی نظام ہے جس میں معلول دینی علت سے اس طرح صادر ہوتا ہے جس طرح ایک ریاضیاتی مسئلہ اپنے بدیہات اور دینی تعریف کے مقدمات سے مستخرج ہوتا ہے۔ اس لئے اسپینوزا کے نزدیک مابعد الطبیعی وقوف ایک قسم کا علم ہے جس کے بغیر نجات ممکن نہیں بلکہ جب ہم کل کے متعلق یہ علم حاصل کر لیں اور اپنے آپ کو اس کے مطابق کر لیں تو گویا ہم نے اپنے ہوائے نفسانی پر قابو پانے کے راستہ پر گامزن ہونا شروع کر دیا۔ اگرچہ انفرادی اشیاء کے متعلق ہمارا علم کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ یہ تبدیل اور ترمیم کیسے عمل میں آئے گی اس کا ذکر بھی کیا جائے گا۔ لیکن دوسری طرف اس کل کے علم کے علاوہ ہمیں خارجی اشیاء سے متعلق اپنی خواہشات اور اپنے جذبات کے خصوصی علم کی بھی زیادہ ضرورت ہے اور کس طرح اس علم کی روشنی میں ہم ان میں رد و بدل کر سکتے ہیں۔

اب ہم زندگی کے اہم ترین مسئلے کی طرف آتے ہیں جیسا کہ اسپینوزا نے اسے پیش کیا اور کس طرح مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں اس کا جواب صورت پذیر ہوا۔

ہمارے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ اگر ممکن ہو تو ہم انسان کے لئے کسی ایسے خیر کی نشاندہی کریں ایک ایسی شئے کو متعین کریں جس سے ہماری جذباتی وابستگی اس طرح کی ہو کہ ہمیں اس سے کبھی ناکامی یا مایوسی کا تجربہ نہ ہو۔ ایک ایسا خیر جس سے ہماری محبت دن بدن بڑھتی چلی جائے اور جس کے باعث ہمیں کامل ترین، بلند ترین اور ہمیشہ رہنے والی خوشی اور سعادت میسر آئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ علم — مابعد الطبیعیاتی اور نفسیاتی علم خاص طور پر — اس خیر کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ کیونکہ اس علم کے باعث ہم عارضی اور ناپائدار مقاصد کی طرف توجہ مبذول کرنے سے رک جاتے ہیں۔ اس استدلال کو جاری رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ یہ علم خود وہ خیر ہے جس کی ہمیں تلاش ہے کیونکہ ناقابل اعتماد جذباتی خواہشات پر فتح پانے کا صحیح راستہ اس علم ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ جس

۲۔ "اصلاح فہم" صفحہ ۴ - ۱۶

کے باعث ہم خواہشات اور اس سے متعلقہ جذبات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے باعث ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ایک جذبہ یونہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کا کوئی نہ کوئی خاص سبب ضرور ہے اور دوسری طرف ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ پائیدار خوشی کے حصول کے معاملہ میں اس جذبے کی تسکین ایک حد کے سے زیادہ نہیں۔ اسی وجہ سے یہ علم ہمیں ایسے جذبات سے وابستگی سے منع کرتا اور روکتا ہے اور اس کی بجائے زیادہ معقول مقاصد سے وابستگی کی ترغیب دیتا ہے۔ اس سے ایک قسم کا اطمینان و سکون اور احساس قوت پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ خوشی کائنات میں قانون علت و معلول سے مکمل واقفیت کا نتیجہ ہے، اس لئے یہ علم ہمارے ذہن میں حصول کی خوشی اور قوت کی زیادتی سے منسلک ہو جاتا ہے۔ اس تلازم کے باعث جو ہماری عمر کے کافی حصے تک پھیلا ہوا ہوتا ہے ہم خود علم کی ہی قدر و منزلت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ اس شے کی بھی جس سے واقفیت ہمیں اس علم سے حاصل ہوتی ہے ـــــ یعنی ریاضیاتی قانون کا وہ لزومی نظام جو اس کائنات میں کارفرما ہے جس میں ہمارے جذبات اور وہ اشیاء جو ان جذبات کو ابھارتی ہیں موجود ہیں اور اس لزومیت کے باعث اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں چونکہ یہ غیر متغیر نظام آخر کار ہماری خوشی کا باعث ہوتا ہے اس لئے ہمارے دل میں اس کی قدر و قیمت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم نہ صرف اسے سمجھ لیتے ہیں بلکہ اس سے محبت بھی کرتے ہیں وہ خیر جس سے ہمیں کبھی ناکامی نہیں ہوتی وہ موجودات کے لزومی نظام کا علم ہے اور اس علم پر مبنی صداقت اور حقیقت سے محبت[1] ہے۔

یہ صحیح ہے کہ شروع شروع میں اس قسم کے خیر سے ہماری دلچسپی اتنی نہیں ہو سکتی جس سے ہمیں متوقع خوشی یا راحت نصیب ہو سکے۔ جہاں جذبات اور خواہشات جو اکثر ناکامی کی طرف لے جاتے ہیں انسان کے قلب کو گرماتے اور اسے کئی قسم کے عمل پر اکساتے ہیں وہاں صداقت اور حق میں دلچسپی ایک بدمزہ اور کمزور سی شے ہے۔ اگرچہ ہمیں ان خواہشات اور تمناؤں کی التباسی

۱۔ لپ مین، کتاب مندرجہ بالا صفحہ ۱۸۰ بعد، ۱۹۰، ۲۲۶ بعد۔

ماہیت کا علم ہوتا ہے پھر بھی ہم ان کی ظاہری کشش سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور پھر اس لزومی نظام کائنات سے جس کے باعث ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، ہمیں محبت کی بجائے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص کسی عورت سے بری طرح محبت کرتا ہے لیکن وہ عورت اسے چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر لیتی ہے یا کچھ عرصہ کی امید افزا ملاقاتوں کے بعد کچھ ایسے حالات رونما ہو جاتے ہیں جس کے باعث ان کی شادی ناممکن ہو جاتی ہے اس کا آسان ردعمل یہ نہیں ہوتا کہ انسان حق و صداقت سے محبت کرنا شروع کر دے بلکہ وہ قسمت کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور کسی اور کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تاکہ شاید اسے وہاں سکون حاصل ہو سکے۔ اس کے باوجود انسان مجبور ہے کہ وہ اس نظام علت و معلول کے ساتھ مطابقت پیدا کرے اور اس سے سبق سیکھے۔ اس سے نفرت کر کے زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ حق و صداقت سے نفرت کرنا غیر معقولیت کی انتہا ہے جو شاید کسی سمجھدار انسان سے ممکن نہیں۔ اس فلسفۂ مذہب کے لئے جس کا یہاں تذکرہ کیا جا رہا ہے یہ ایک مرکزی نقطہ ہے۔

ایسی مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نجات کے لئے یہ جاننا کافی نہیں کہ ہمیں زندگی میں ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہماری راہنمائی کے لئے مابعد الطبیعیاتی علم کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم اسی توقع میں زندگی بسر کر دیں گے کہ اس کائنات کو ہماری بعض غیر معقول خواہشات اور تمناؤں کو پورا کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر ہمیں اس حقیقت کا علم ہو کہ یہ کائنات ایک ایسے طریقہ کے مطابق چل رہی ہے جس میں کسی بے معنی تبدیلی کا امکان نہیں اور اس کا نظام بالکل ریاضیاتی قسم کا سا ہے جو جبر و لزوم کے اصولوں کی پیروی کر رہا ہے تو پھر وہ اپنے روزمرہ کے افعال اور اعمال کو اس کے مطابق کرنے کی کوشش کرے گا اور اس طرح ناکامیوں اور نامرادیوں سے مایوس اور دل برداشتہ ہونے کی بجائے ایک فطری امر سمجھ کر زندگی گذارے گا۔ اس کے جذبات میں فہم و عقل کے باعث ایک تبدیلی پیدا ہو گی اور اس سے قوت اور آزادی میں اضافہ محسوس ہو گا۔ ہر ناکامی و نامرادی کے بعد اس علم کی بدولت جو سبق حاصل ہو گا اس سے وہ

اس علم اور اس غیر جانبدار نظام سے پہلے سے زیادہ محبت کرنی شروع کرے گا۔ تمام عارضی اور ناپائیدار محبتوں کے مقابلہ پر حق و صداقت سے محبت زیادہ ہوتی چلی جائیگی۔ اور اس محبت کی گہرائی اور وسعت کی کوئی حد نہیں۔ جب آدمی زندگی کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھنا اور پرکھنا شروع کرے تو ہر قدم پر جو بھی تجربہ ہوگا وہ اس محبت میں کمی پیدا کرنے کی بجائے اس میں اور زیادہ شدت اور گرمی پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ ہر حالت میں علم میں اضافہ ہوگا اور اس کے ساتھ حق و صداقت سے محبت بڑھتی چلی جائے گی۔ اس کے ساتھ وہ جذبات و تاثرات جو اس محبت کے منافی ہوں گے اسی نسبت سے کم موثر ہوتے چلے جائیں گے۔ جب کبھی ہمیں ان جذبات و خواہشات کے باعث ناکامی ہوگی تو ہمیں ان کی کشش ماند پڑتی معلوم ہوگی۔ وہ اشیاء یا مقاصد جو کبھی پہلے ہمارے لئے انتہائی کشش اور دلچسپی کا موجب تھے آہستہ آہستہ اپنی تمام دلکشی کھو بیٹھتے ہیں۔ ہماری توجہ بالمرکز ان سے ہٹ کر زیادہ پائیدار اور قابل اعتنا مقاصد کی طرف ہو جائیگا اور ان سے ہمیں بہتر خوشی اور راحت حاصل ہو سکے گی[1] یقیناً یہ کوئی معجزہ نہیں۔ انسان اپنی قوت و استعداد کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک یاضیاتی نظام کی حقیقت اور اس کے شعوری وقوف سے راحت حاصل کرنے کے معاملہ میں بھی وہ مختلف صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ کوئی اس احساس سے زیادہ سرور و لذت حاصل کرتا ہے اور کوئی کم۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ اکثر انسان اس حالت تک پہنچنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں جس کے باعث وہ ایک اطمینان بخش زندگی بسر کر سکیں۔ چنانچہ سپینوزا اپنی مشہور کتاب "اخلاقیات" میں کہتا ہے:

"ہم آسانی سے اس حقیقت کو پا سکتے ہیں کہ واضح اور صحیح علم اور خاص کر علم کی تیسری قسم جو خدا کی ذات کے مشاہدے پر مبنی ہے ایک ایسی قوت ہے جو جذبات کو اپنے قابو میں لے آتی ہے ممکن ہے کہ وہ ان جذبات کو ان کے ہوائے نفسانی ہونے کی حیثیت میں بالکل ختم کر دے لیکن

۱- اسپنوزا - اخلاقیات، حصہ پنجم تقضیات ۱، ۱۶۲-

اگر وہ بالکل ختم نہ بھی کر سکے پھر بھی ان کو انسانی زندگی میں ایک ثانوی حیثیت دلا دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ قلب میں ابدی اور غیر متغیر مقصد سے محبت پیدا کرتی ہے جو ہماری ذات پر مسلط ہو جاتی ہے وہ نفسانی محبت کے نقائص سے آلودہ نہیں ہو پاتی اور لمحہ بہ لمحہ اور دن بہ دن اس میں اتنی شدت اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ہماری زندگی کا کل سرمایہ قرار پاتی ہے[1]

یہ ایک ایسا خیر ہے جس سے ہمیں کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ وہ مسلسل اور نہ ختم ہونے والی خوشی کا موجب ہوتا ہے۔ یہ ایسی خوشی ہے جو ہر تجربے سے بڑھتی اور آہستہ آہستہ ساری زندگی پر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہی وہ خیر ہے جس کی تلاش زندگی کا مقصد اولیٰ ہے۔

لیکن دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو کم عقل کے ہوتے ہیں اور جن کے مادی تحفظ اور سکون کی اتنی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اس نصب العین کو حاصل کرنے کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے۔ سپینوزا ایسے لوگوں کی مجبوریوں سے پوری طرح واقف ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب "دینیاتی اور سیاسی مقالہ" میں ایسے لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ جس مذہب کے پیرو ہیں اس کے بہترین عناصر کی پیروی کریں۔ اگر حقیقت کا علم ان کی دسترس سے باہر ہے تو پھر اخلاقی پاکیزگی کی زندگی ان کے لئے بہترین نصب العین ہے۔ ان سے انہیں قلبی سکون و اطمینان حاصل ہوگا اور سماجی زندگی میں دوسروں کے تعاون سے عمر گذارنے کے لئے اخلاقی راہنمائی دستیاب ہوگی۔

اب ہم اس قابل ہیں کہ اس فلسفہ مذہب کو مذہب سائنس کہنے کا جواز پیش کر سکیں۔ جدید دور میں سائنس سے مراد (اگر تسخیر فطرت کے عملی پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے) مندرجہ ذیل دو عناصر ہیں: دنیا کے متعلق ایک خاص نظریہ اور اس نظریے کی بنیاد پر ایک تلاش و جدوجہد۔ دنیا کے متعلق سائنسی نظریہ یہ ہے کہ یہ ایک غیر جانبدارانہ نظام ہے جس میں ہر واقعہ ایک مقررہ قانون علت معلول کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہ قانون ریاضیاتی کلیات کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ تلاش سے مراد

---

[1] سپینوزا۔ اخلاقیات، حصہ پنجم۔ قضیہ ۲۰

یہ ہے کہ اس نظام کائنات کے امور واقعات اور حقائق کا علم حاصل کیا جائے۔ اور اس طرح اس اساسی نظریے کی تائید کی جا سکے۔ زیر بحث فلسفۂ مذہب کے نزدیک یہ دونوں عناصر نہ صرف سائنس کی روح اور اس کی خصوصی منفعت میں شامل ہیں بلکہ مذہب کے اساسی مسئلہ کا جواب بھی انہی پر منحصر ہے مذہب کا بلند ترین نصب العین یہی غیر جانب دارانہ نظام کائنات ہے۔ انسان کا خیر اعلیٰ اس ہمہ گیر صداقت کا علم اور اس سے محبت ہے۔ اس سے انسان کو وہ کچھ مل جاتا ہے جو مذہب انسان کو دیتا ہے۔ وہ بلند ترین وجود جس سے محبت کے باعث عارضی اور ناقابلِ اعتماد جذبات و خواہشات پر قابو پایا جا سکتا اور ابدی خوشی اور سعادت حاصل کی جا سکتی ہے۔

اسپینوزا نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دینیاتی فکر کے بڑے بڑے تصورات کی اس طرح تاویل کی کہ وہ اس نقطۂ نگاہ سے ہم آہنگ ہو گئے۔ اس کے مقالات اور کتابوں میں اصلاحات تو تقریباً وہی ہیں جو عیسائی مذہبی روایات میں مروج تھیں۔ اس کائنات کی اساس مطلق خدا ہے جس سے تمام واقعات کا حدوث اور صدور ایک ہندسی لزومیت کی طرح ہوتا ہے۔ خدا کی ذات لامحدود اور اکمل ہے لیکن یہ کمال نصب العین ذات جیسا نہیں۔ اس سے مراد اس کی قوت کا کمال اور اس کے عمل کی غیر جانبداری ہے جس کے باعث ہر فعل جو اس سے صادر ہوتا ہے ایک قانون کے مطابق ہوتا ہے یہ شخصی کمال نہیں بلکہ ریاضیاتی کمال ہے۔ انسان کی نجات اور اُخروی سعادت کا دار و مدار خدا کی ذات کا علم اور اس علم کی بنیاد پر اس سے محبت پر ہے۔ جسے اسپینوزا خدا کی ذات سے "عقلی محبت" کا نام دیتا ہے۔

ان مفروضات کی بنا پر اسپینوزا نے انسانی بقائے ذات کا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ افلاطون کے اس نظریے کی حمایت تو نہیں کر سکتا جس کو اس نے اپنے مکالمہ فیڈو میں پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق انسانی روح ایک ناقابلِ فنا جوہر ہے جو جسم سے آزاد بھی ہے۔ اسپینوزا کے نزدیک انسان موت کے بعد قائم رہتا ہے۔ یہ نظریہ ارسطو کے نظریے کے مماثل یقیناً نہیں ہے۔ ہمارے ادراکات، قوتِ حافظہ، متخیلہ اور جذبات ــــ یہ تمام افعال جن کی نوعیت انفعالی ہے اور جن کا انحصار جسمانی اعضاء پر

ہے فانی ہیں۔ لیکن علم اگر وہ سچا اور صحیح علم ہے اس کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔ صحیح علم انسان کو محدودیت کی پابندیوں سے بالا کر دیتا ہے۔ صحیح علم سے انسان ابدیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے صحیح علم درحقیقت کسی شے کی اس اصل ماہیت کا علم ہے جو خدا کی ابدی ذات کا حصہ ہے اور جس کا وجود خدا کے لزومی قانون کا لزومی نتیجہ ہے۔ ایسا علم خدا کا اپنی ذات کے متعلق علم کا حصہ ہے[1]۔ جو تغیر و فنا سے بالا ہے چنانچہ خدا سے محبت چونکہ صحیح علم سے پیدا ہوتی اور اس پر منحصر ہے اسلئے یہ عارضی جذبہ نہیں بلکہ باقی اور ابدی ہے۔ تاہم یہ انسانی علم اور محبت خدا کا اپنی ذات کا علم اور اس سے محبت کے مترادف نہیں۔ ان میں ہر شخص کی انفرادی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر انسانی ذہن ایک جسم سے وابستہ ہے جو ایک خاص زمان و مکان میں موجود ہے اور جس کے باعث اس کے اپنے خصوصی افعال اور واردات ہوتے ہیں۔ پس اگر ہم خدا کا صحیح علم حاصل بھی کر لیں اور محسوس کر لیں کہ اس دنیا کی ہر شے کا وجود اس کی ذات پر منحصر ہے پھر بھی یہ ہمارا علم چند ان حدود اور پابندیوں سے ضرور متاثر ہوتا ہے جو ہمارا جسم ہم پر اور ہمارے علم پر عاید کرتا ہے یہ ابدی صداقت کا علم ہے لیکن چونکہ ہر شخص دوسرے سے علاحدہ وجود رکھتا ہے اس لئے ہر شخص کا یہ علم دوسرے سے متغیر اور منفرد ہوتا ہے۔ ہر ذہن کا ابدی اور باقی رہنے والا حصہ دوسرے ذہنوں کے ابدی اور باقی رہنے والے حصوں سے مختلف ہوتا ہے[2]۔

اسپینوزا کے بعد کا ارتقاء

اسپینوزا کے بعد جیسے جیسے سائنس کے تصورات اور مذہب کی اصطلاحات میں تغیرات ہوتے گئے اسی طرح اس فلسفۂ مذہب میں بھی کئی تبدیلیاں ظاہر ہوئیں۔ انیسویں صدی

۱۔ چونکہ اسپینوزا کے نزدیک خدا ذہن اور مادہ دونوں کا منبع و مصدر ہے اس لئے وہ فکر اور پھیلاؤ دونوں سے متصف ہے چنانچہ وہ لامحدود علم رکھتا ہے۔ اس علم اور اس کے اجزاء (یعنی انسانی ذہن) کا باہمی تعلق اسپینوزا کے نزدیک خالی نوعیت نہیں رکھتا بلکہ اس کی نوعیت ریاضیاتی تعین کی سی ہے۔

۲۔ اخلاقیات، حصہ پنجم، قضیات ۲۱، ۴۰۔

کے آخری زمانے تک جو تبدیلیاں ہوئیں وہ تین قسم کی ہیں: (۱) ریاضیاتی قانون کے ساتھ تجربی طریقہ کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا جانے لگا۔ (۲) کائنات کی سائنسی تصویر ہندسی کی بجائے حرکی ہو گئی۔ طبیعیات کے قوانین اب ہندسی استدلال کی بجائے قوت اور کمیت (مادہ) کی اصطلاحات میں پیش کئے جانے لگے۔ (۳) مذہب کے بہت سے روایتی تصورات جدید فکر کی روشنی میں یا تو بے بنیاد معلوم ہونے لگے یا ان سے مطابقت نہ رکھنے کے باعث متروک ہو گئے اس لئے فلسفیانہ فکر کی اساس اب ان کے بغیر بھی بیان کی جانے لگی۔ مؤخر الذکر کی مثال نجات اور سعادت اُخروی ہے اور اول الذکر کی مثال بقائے شخصی کا تصور ہے اسپینوزا کا خیال تھا کہ اس کائنات کی اساسی تعمیر میں فکر کا ویسا ہی حصہ ہے جیسا پھیلاؤ اور حرکت کا لیکن انیسویں صدی میں سائنس کا خیال تھا کہ فکر مادے کے تغیرات کی ایک ضمنی پیداوار ہے اور اس لئے موت کے بعد اس کا باقی رہنا ممکن نہیں ایسے ماحول میں جو سائنسی مذہب کی شکل ممکن تھی وہ آرنسٹ ہیکل کا "وحدیتی مذہب" ہے جس کی تفصیل اس کی مشہور کتاب "کائنات کا معمہ"[۱] اور بعض دوسری کتابوں میں پیش کی گئی ہے۔ ہیکل کو کوئی اعتراض نہیں اگر ہم محیط کل جوہر کائنات کے لئے خدا کا لفظ استعمال کریں لیکن اس نے دوسری مذہبی روایتی اصطلاحات کو بالکل رد کر دیا۔ اس کے نظریہ کے مطابق صداقت سے محبت ایک مرکزی نقطہ ہے لیکن جتنی اہمیت اس کو اسپینوزا کے ہاں حاصل تھی وہ یہاں نظر نہیں آتی اس کے نزدیک صداقت سے محبت، خیر کے نصب العین کی تمنا اور جمال کے مختلف مظاہر سے دلچسپی سب یکساں مذہبی اہمیت رکھتے ہیں۔[۲]

۱۔ اس کتاب کے باب ۱۱، ۱۲، ۱۵ اور ۱۸ خاص طور پر دیکھئے۔ (۲) اس حیثیت سے ہیکل کا نظریہ دراصل ایک قسم کی انسانیت (HUMANISM) بن جاتا ہے ـــــــــــ موجودہ دور میں سائنسی مذہب اور انسیت کی اس شکل میں کوئی تمیز ممکن نہیں جس کے مطابق سائنسی علم اور صداقت سے محبت مخصوص مذہبی اقدار ہیں لپ مین (LIPPMAN) دونوں نظریات کا پیرو ہے۔

ماضی قریب میں اس قسم کا فلسفۂ مذہب زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔ سائنس سے متاثر مفکرین کے تصورات متعلقہ کائنات میں انقلاب انگیز تغیرات رونما ہو چکے ہیں اور یہ تغیرات جس طرح مذہبی افکار پر اثر انداز ہو رہے ہیں، ان کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس طرح کے مذہبی فلسفہ کے چند اساسی پہلو جس کے باعث وہ دوسرے مکاتیب فکر سے متغیر ہوتا ہے واضح طور پر پیش کئے جا چکے ہیں۔ والٹر لپ مین نے اپنی مشہور کتاب "اخلاقیات کا ابتدائیہ" میں سائنسی مذہب کی مذکورہ بالا شکل کو تسلیم کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد پیدا شدہ پیچیدہ سماجی ماحول میں انفرادی اور عمرانی مطابقت جیسے مشکل مسئلہ کا حل ایسے ہی سائنسی مذہب کے ذریعے ممکن ہے۔ اسکی خصوصی صفات مندرجہ ذیل ہیں۔ یہ کائنات ایک معروضی اور خارجی نظام ہے جو انسانی ضروریات اور خواہشات کے تابع نہیں ایسی خواہشات اور تمناؤں سے برتر ہے اور آزادی جو اس اصول کے خلاف ہیں اور جس سے اخلاقی حیثیت میں ایک بے نیازی اور غیر جانبداری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ انسان کی قوت فہم اس کی فطرت کا وہ عنصر ہے۔ جو اس رجحان کے مطابق عمل پیرا ہو سکتا ہے اور اس کی مدد سے مسلسل ارتقا پذیر اقدار کی تلاش ہوتی ہے۔

زیر بحث فلسفۂ مذہب کے نقطہ نظر سے مذہب اور سائنس کے متعلق کو بیان کرنے کے لئے ہمیں صرف مختصر سے اشارے کی ضرورت ہے۔ چونکہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ جدید سائنس نے جو تصور کائنات اور صداقت کا پیش کیا ہے وہ اساسی طور پر صحیح ہے اس لئے سائنس اور مذہب کے درمیان کسی قسم کی آویزش کا امکان نہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ علم کا حصول ایک خاص مذہبی قدر ہے اس لئے مذہب اور سائنس کا تعلق ایک تعمیری ہم آہنگی اور تعاون کا ہے۔ اگر اس مطابقت اور ہم آہنگی کو تسلیم کر لیا جائے تو سائنس اور مذہب میں ایسا ہی اتحاد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ زمانۂ وسطیٰ میں ارسطو کی پیش کردہ سائنس کی بنیاد پر قائم تھا۔